نبی اکرم ﷺ پر جادو کیے جانے کی حقیقت۔۔۔ اشکالات کا تجزیہ

پروفیسر محمد اکرم ورک
شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج قلعہ دیدار سنگھ، گوجرانوالہ

کفار مکہ اور دیگر معترضین نے نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر جو مختلف اعتراضات کئے ہیں ان میں سے ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ معاذ اللہ آپ ﷺ ایک جادو زدہ شخص ہیں اور یہ کہ مسلمان ایک ایسے شخص کی پیروی کر رہے ہیں جس پر جادو کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو کھلی گمراہی قرار دیتے ہوئے رد فرمایا ہے۔(1)

جبکہ دوسری طرف بعض صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ پر جادو کیا گیا تھا اور ایک عرصہ تک آپ ﷺ پر اس کا اثر بھی رہا۔ چونکہ یہاں قرآن و حدیث میں بظاہر تعارض ہے اور خود آپ ﷺ کی شخصیت کے بارے میں کئی طرح کے سوالات سامنے آتے ہیں، اس لئے اس بارے میں متقدمین اور متاخرین علماء میں ہمیشہ یہ اختلاف رہا ہے کہ آیا آپ ﷺ پر جادو کا اثر پڑ جانا حق ہے یا باطل؟۔ ذیل کی سطور میں ہم اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کریں گے، لیکن اس سے پہلے آپ حدیث کا مکمل متن ملاحظہ فرمائیں جس میں آپ ﷺ پر جادو کیے جانے کا تفصیلی بیان ہے۔ حضرت عائشہؓ (م ۵۷ھ) بیان فرماتی ہیں:

"سحر رسول اللہ ﷺ حتی انہ لیخیّل الیہ انہ یفعل الشیء، وما فعلہ، حتی اذا کان ذات یوم وھو عندی دعا اللہ ودعاہ ثم قال

ﷺ: "أشعرت یا عائشةؓ ان اللہ قد أفتانی فیما استفتیتہ فیہ؟" قلت: وما ذاک یا رسول اللہ ﷺ؟ قال ﷺ: "جاءنی رجلان فجلس احدھما عند رأسی، والأخر عند رجلیّ ثم قال احدھما لصاحبہ: ما وجع الرجل؟ قال: مطبوبٌ، قال: ومن طبّہ؟ قال: لبید بن الأعصم الیھودی من بنی زریق، قال: فیما ذا؟ قال: فی مشط ومشاطة وجف طلعة ذکر، قال: فأین ھو؟ قال: فی بئر ذی أروان" قال: فذھب النبی ﷺ فی اناس من اصحابہ الی البئر فنظر الیھا وعلیھا نخل، ثم رجع الی عائشةؓ، فقال ﷺ: "واللہ لکأنّ ماءھا نقاعة الحنّاء، ولکأنّ نخلھا رؤس الشیاطین"، قلت: یا رسول اللہ ﷺ، أفأخرجتہ؟ قال ﷺ: "لا، أما أنا فقد عافانی اللہ وشفانی وخشیت أن أثوّر علی الناس منہ شرًا"، وأمر بھا فدفنت"(2)

" رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا آپ ﷺ کو خیال ہوتا کہ آپ ﷺ نے ایک کام کر لیا ہے حالانکہ نہ کیا ہوتا۔ ایک دن آپ ﷺ میرے پاس تھے، آپ ﷺ نے اللہ کو پکارا، اللہ نے آپ ﷺ کی دعا قبول کی پھر فرمانے لگے، عائشہ تجھ کو معلوم ہوا اللہ سے جو بات میں نے پوچھی تھی وہ اللہ نے مجھ کو بتلا دی، میں نے کہا: فرمایئے تو کیا بات تھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس دو فرشتے آئے ایک تو میرے سرہانے بیٹھا اور ایک میرے پاؤں کے پاس، سرہانے والے نے پائنتی والے سے پوچھا: ان صاحب کو کیا عارضہ ہے؟ اس نے کہا: (عارضہ نہیں) ان پر جادو کیا گیا ہے۔ پہلے نے پوچھا: کس نے جادو کیا ہے؟ دوسرے نے کہا: لبید بن اعصم یہودی نے جو بنی زریق کا ہے۔ پہلے نے پوچھا: کس چیز میں جادو کیا ہے؟ دوسرے نے کہا: کنگھی اور بالوں اور کھجور کے غلاف میں۔ پہلے نے پوچھا: یہ سامان کہاں رکھا ہے؟ دوسرے نے کہا: ذی اروان کے کنویں میں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: نبی ﷺ اپنے کئی اصحاب کے ساتھ اس کنویں پر تشریف لے گئے اس کو دیکھا وہاں کھجور کے درخت بھی تھے۔ جب لوٹ

کر آئے تو مجھ سے فرمایا، عائشہؓ خدا کی قسم اس کا پانی ایسا رنگین تھا جیسے مہندی کا پانی اور کھجور کے درخت کیا تھے گویا سانپوں کے پھن (یا شیطانوں کے سر) میں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے وہ کنگھی، بال وغیرہ (غلاف سے) نکلوائے؟ (یا نہیں)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، سن لے اللہ نے مجھ کو شفا دی، تندرست کر دیا اب میں ڈرا کہیں لوگوں میں شور نہ پھیلے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سامان کے گاڑ دینے کا حکم دیا اور وہ گاڑ دیا گیا۔''

اعتراضات واشکالات

محدثین، مفسرین اور سیرت نگاروں کی اکثریت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جادو کا اثر ایسے ہی ہوا جیسے آپ ﷺ کو بیماری اور دیگر انسانی عوارض لاحق ہوئے تھے جبکہ جادو کا کوئی اثر آپ ﷺ کی عقل پر نہیں ہوا۔ کچھ محدثین نے مسلم اور بخاری کی ان روایات کی توثیق کی ہے جن میں نبی ﷺ پر جادو کی اثر پذیری کا بیان ہے۔ جن اہل علم نے ان احادیث پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے ان میں امام ابو بکر جصاصؒ (م ۳۷۰ھ) (3) ، امام فخر الدین رازیؒ (م ۶۰۶ھ) (4) ، جبکہ متاخرین میں سے سید قطب شہیدؒ (م ۱۹۶۶ء) (5) علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلویؒ (م ۱۹۹۱ء) (6) شبیر احمد ازہر میرٹھیؒ (م ۲۰۰۵ء) (7) قابل ذکر ہیں۔

غلام احمد پرویز (م ۱۹۸۵ء) (8) اور ڈاکٹر شبیر احمد نے ایسی حدیث کو قرآن مجید کی آیات (۱۷/۴۷ اور ۸/۲۵) سے متصادم گردانتے ہوئے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ (9) طوالت سے بچتے ہوئے ہم نے ان تمام اہل علم کے زیر بحث موضوع پر اعتراضات نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے، تاہم سرسید احمد خانؒ (م ۱۸۹۸ء) نے زیر بحث موضوع سے متعلق احادیث پر تنقید کرتے ہوئے جو اعتراضات کئے ہیں اس میں ان تمام حضرات کی نمائندگی ہو جاتی ہے اس لئے یہاں ہم صرف سرسیدؒ کے الفاظ نقل کرنے پر ہی اکتفاء کریں گے۔ سرسیدؒ اس نوع کی احادیث پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر ہم یہ کہیں کہ نعوذ باللہ جناب پیغمبر خدا ﷺ کی ذات مبارک پر باوصف اس قدر تقدس وطہارت ہونے کے جادو ہو جاتا تھا تو ہم اس بات پر کیونکر یقین کریں کہ کونسی بات انہوں نے جادو ہونے کی حالت میں فرمائی ہے؟ اور کون سی جادو اتری ہوئی حالت میں فرمائی ہے؟ تو ہمارے زمانے کے عالم فرماتے ہیں

کہ یہ دوسرا کفر بکا، مگر کچھ ہی ہو، ہم تو یقین نہیں کرتے کہ آنحضرت ﷺ پر جادو ہوا تھا۔''

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''لوگ کہتے ہیں کہ جناب سرور انبیاء، پیغمبر خدا محمد مصطفیٰ ﷺ پر جادو کر دیا گیا تھا۔ خدا فرماتا ہے:

﴿اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۱۷/۴۷)﴾''

کافر آپس میں کہتے ہیں کہ تم تو صرف ایک شخص کی پیروی کرتے ہو جس پر سحر کر دیا گیا ہے۔'' یہی بات فرعون نے موسیٰؑ سے کہی تھی: ﴿فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا (۱۷/۱۰۱)﴾ پس قرآن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کافر ہو جو یہ کہے کہ پیغمبر پر جادو کر دیا گیا تھا۔ مگر اس زمانے کا باوا آدم ہی نرالا ہے، اب بڑے بڑے عالم یہ کہتے ہیں کہ جو یہ نہ کہے اور اس پر یقین نہ کرے کہ آنحضرت ﷺ پر جادو کر دیا گیا تھا، تو وہ کافر ہے۔ زمانہ الٹ گیا ہے، سچ ہے: "والدھر بالناس قلب"۔ (10)

مندرجہ بالا سطور میں جن اہل علم کا ہم نے ذکر کیا ہے ان کے اعتراضات سے بنیادی طور پر دو نکات ہی سامنے آتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

ایک، کفار کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ انبیاء کو یا تو جادوگر کہتے تھے یا جادو زدہ (مسحور) کہتے تھے۔ اگر ہم خود ہی نبی ﷺ پر جادو اور اس کی اثر پذیری کو تسلیم کر لیں تو اس سے کفار کی تائید خود بخود ہو جائے گی، لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ انبیاء پر جادو کا کبھی کوئی اثر نہیں ہوا۔

دوسرا یہ کہ اگر نبی ﷺ پر جادو کا اثر تسلیم کر لیا جائے تو اس سے شریعت کی ساری بنیادیں ہی منہدم ہو جاتی ہیں، نہ معلوم نبی نے کون سی بات وحی کے زیر اثر کہی اور کون سی بات جادو کے زیر اثر؟۔

توضیحات

اب ہم ان اشکالات کا دلائل کی روشنی میں جائزہ لیں گے۔

سب سے پہلے تو ہم اس اشکال کا جائزہ لیں گے کہ اگر نبی ﷺ پر جادو اور اس کی اثر پذیری کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے کفار کے اس قول کی تائید خود بخود ہو جاتی ہے جو وہ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: ﴿اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۱۷/۴۷)﴾ ''تم تو صرف ایک ایسے شخص

کی پیروی کرتے ہو جس پر سحر کر دیا گیا ہے۔"

اس اعتراض کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہاں ہم ایک اصولی بات کی طرف توجہ دلائیں گے کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام انبیاء حضرت آدمؑ کی اولاد اور نوع انسانی ہی کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے بتقاضۂ بشریت ان کو بھی وہ عوارض لاحق ہوتے ہیں جو دوسرے لوگوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ سیرت طیبہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی دوسرے انسانوں کی طرح بیمار ہوئے، زخمی ہوئے، گھوڑے سے گر کر چوٹ بھی لگی، عین حالت نماز میں بچھو نے کاٹ لیا۔ جب آپ ﷺ کا ان تمام عوارضات سے دوچار ہونا تاریخی حقیقت ہے تو جادو کے زیر اثر آپ ﷺ کا بیمار ہونا بھی عجیب بات نہیں ہے، جبکہ انبیاء کرامؑ پر جادو کا اثر پذیر ہونا خود قرآن سے ثابت ہے۔

فرعون کے جادوگروں نے جب ہزارہا لوگوں کے مجمع میں اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو وہ سانپ بن کر دوڑنے لگیں اور جادوگروں نے پورے مجمع کی آنکھوں میں جادو کر دیا۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ﴾　(الاعراف، ۷:۱۱۶)

"تو انہوں نے لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کر دیا۔"

اس جادو کا اثر موسیٰؑ پر بھی ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان کو تسلی دی:

﴿فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى وَاَلْقِ مَا فِیْ يَمِيْنِكَ﴾　(طٰہٰ، ۲۰:۶۹)

"موسیٰؑ اپنے دل میں ڈر گئے تو ہم نے بذریعہ وحی کہا: اے موسیٰ! ڈرو مت، تم ہی غالب رہو گے، اور تم ڈال دو جو (عصا) تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

کافروں کی ہر بات کو رد کرنا دانش مندی نہیں اگر اسی اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر حضور ﷺ پر ان کے اس اعتراض کا جواب کیا ہوگا۔ جب وہ کہا کرتے تھے:

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان، ۲۵:۷)

"اس رسول ﷺ کو دیکھو اسے کیا ہو گیا کہ کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔"

کیا ان کی اس بات کو غلط قرار دیا جائے گا؟ بات صرف اس قدر ہے کہ نادان اور کم فہم لوگ انبیاء کرامؑ کی طرف ہر وہ چیز منسوب کر دیا کرتے تھے جسے وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کی رسالت وصداقت میں

نقص کا باعث ہے۔ خواہ وہ چیز واقعتاً حق ہی کیوں نہ ہوتی، جیسا کہ ان لوگوں نے جادو کو رسالت کے لئے باعث نقص سمجھ لیا، ورنہ اس بات میں کسے شبہ ہے کہ کفار کا "اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا" کہنے سے یہ مطلب نہ تھا کہ حضور ﷺ پر چند دن جادو کا اثر رہا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو شفایاب کر کے آپ ﷺ کی وحی اور دین کو اس بات سے محفوظ کر دیا کہ اس میں کسی قسم کی غلطی کا امکان باقی ہو۔ بلکہ ان کی مراد اس سے یہ تھی کہ جس قرآن کو یہ رسول لے کر آیا ہے، نہ وہ اللہ کا کلام ہے اور نہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے، بلکہ وہ ہذیان، بڑبڑاہٹ اور عقل کے فتور کا نتیجہ ہے۔ یقیناً یہی ان کی مراد ہے اور اس بات میں یقیناً وہ جھوٹے تھے۔ جو چیز حدیث سے ثابت ہوتی ہے وہ مشرکین کے قول سے ثابت نہیں ہوتی اور جو ان کے قول سے ثابت ہوتی ہے وہ حدیث سے ثابت نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب دونوں کا مقصد جدا ہے تو ایک سے دوسرے کی موافقت وتصدیق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رسول اللہ ﷺ پر جادو کا واقعہ فتح خیبر ۷ھ کے بعد پیش آیا۔ وہ لوگ جو قوم یہود کی نفسیات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر کثرت کے ساتھ اپنی نعمتوں کا نزول فرمایا تھا اور ان کو تمام جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف واضح معجزات کے باوجود کفر و شرک کی راہ اختیار کی بلکہ انبیاء کرام کے قتل سے باز نہ آئے۔ چنانچہ ان بدبختوں نے حضرت زکریاؑ، ان کے بیٹے یحییٰؑ اور دیگر کئی انبیاء کرامؑ کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا، پھر انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی قتل کرنے کا دعویٰ کیا، اگرچہ قرآن مجید نے یہود کے دعویٰ کو رد کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ (النساء، ۴:۱۵۷)

"اور نہ وہ آپ کو قتل کر سکے اور نہ ہی آپ کو سولی چڑھا سکے۔"

بالآخر اپنی بدکرداریوں کی بدولت یہ قوم اللہ کی ناپسندیدہ ٹھہری۔ ہجرت مدینہ کے بعد بھی ان لوگوں نے اسلام اور بانی اسلام ﷺ کے خلاف ہر موقع پر اپنے خبث باطن کا کھل کر اظہار کیا۔ ایک موقع پر جب آپ ﷺ کسی تصفیہ طلب مسئلہ کے لئے ان کے ہاں تشریف لے گئے تو ان لوگوں نے آپ ﷺ کو ایک مکان کی چھت سے پتھر گرا کر قتل کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ان کی سازش سے قبل از وقت آگاہ فرما دیا لہٰذا آپ ﷺ محض اللہ کے فضل سے محفوظ رہے۔ (11)

غزوۂ خیبر میں ذلت آمیز شکست کے بعد ان لوگوں کا انتقام دوچند ہو گیا۔ خیبر میں ہی ایک یہودیہ نے کھانے کی دعوت میں زہر آلود گوشت کے ذریعہ آپ ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی، لیکن اللہ نے آپ ﷺ کو محفوظ رکھا۔ تاہم اس زہر کا اثر باقی رہا اور بعض روایات کے مطابق زہر کے اسی اثر کے

لوٹ آنے کی وجہ سے آپ ﷺ کا وصال ہوا۔ امام ابن قیم" (م ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

"واحتجم رسول اللّٰہ ﷺ علی کاهله، من أجل الذی أکل من الشاة (حجمه ابو هند بالقران والشفرة) وبقی بعد ذالک ثلاث سنین، حتی کان وجعه الذی توفی فیه، فقال: مازلت أجد من الأکلة التی أکلت من الشاة یوم خیبر، حتی کان هذا أوان انقطاع الأبهر منی فتوفی رسول اللّٰہ ﷺ شهیدا"(12)

"نبی ﷺ نے اپنے کندھے پر سینگی لگوائی، کیونکہ آپ ﷺ نے بکری کا زہریلا گوشت کھایا تھا۔ (آپ ﷺ کو ابو ہند نے قران اور شفرہ کے مقام پر سینگی لگائی تھی) اس کے بعد آپ ﷺ تین سال زندہ رہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو وہ تکلیف لاحق ہوئی جس میں آپ ﷺ کا انتقال ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے خیبر کے موقع پر جو گوشت کھایا تھا، اس کا اثر مجھے محسوس ہوتا رہا ہے اور اب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری رگ کاٹی جا رہی ہو۔ چنانچہ نبی ﷺ کو شہادت کی موت نصیب ہوئی۔"

لبید بن اعصم اور اس کی بیٹیوں نے آپ ﷺ کو جادو کے ذریعہ جو نقصان پہنچانے کی کوشش کی یہ دراصل ان کی انہی سابقہ کوششوں کا تسلسل تھا لیکن جلد ہی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس پریشانی سے نجات عطا فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ پر جادو کی اثر پذیری کا واقعہ کئی حوالوں سے آپ ﷺ کی صداقت اور نبوت کی دلیل ہے، ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

"وقع فی مرسل عبدالرحمٰنؒ بن کعب عند ابن سعد فقالت أخت لبید بن الأعصم: أن یکون نبیاً فسیخبر و الافسیذهله هذا السحر حتی یذهب عقله"(13)

"عبدالرحمٰن بن کعب کہتے ہیں کہ لبید بن اعصم (یہودی جس نے جادو کیا تھا) اس کی بہن نے کہا: اگر یہ نبی ﷺ ہوگا تو اسے خدا کی طرف سے اطلاع مل جائے گی (کہ فلاں نے جادو کیا، فلاں شے میں کیا اور فلاں جگہ دفن کیا) اور اگر نبی نہ ہوا تو یہ جادو اس کی عقل کو نقصان پہنچائے گا۔ یہاں تک کہ اس کی عقل کو لے جائے گا۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ ﷺ کو تمام صورت حال سے آگاہ فرما دیا جیسا کہ اس موضوع کی کثیر روایات سے واضح ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے یہ واقعہ آپ ﷺ کی صداقت اور نبوت کی واضح دلیل ہے۔ اور یہ بالکل ایسے ہے جیسے غزوۂ خیبر کے موقع پر آپ ﷺ کو زہر دینے والی یہودیہ عورت نے کہا تھا۔ کہ اگر یہ نبی ہوگا تو اس کو زہر نقصان نہیں دے گا یعنی اس سے ہلاک نہیں ہوگا۔ ورنہ بدنی تکلیف آپ ﷺ کو بہت ہوئی اور ہمیشہ رہی یہاں تک کہ آخر آپ ﷺ نے اسی سے وفات پائی مگر چونکہ یہ وفات آپ ﷺ کے خلاف معمول معجزانہ رنگ میں تھی، کیونکہ زہر کا اثر اس وقت ظاہر ہوا جب کئی سالوں بعد نبوت کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ نیز اسی گوشت نے آپ ﷺ کو خبر دی جس میں زہر ملایا گیا تھا۔ لہٰذا جیسے یہ واقعہ آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے ایسے ہی جادو کا واقعہ بھی آپ ﷺ کی نبوت اور سچائی کی دلیل ہے۔

حدیث سحر پر ایک اور پہلو سے بھی غور کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اس واقعے میں عقیدہ توحید کو ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک رکھنے کا نصیحت آمیز پہلو بھی موجود ہے جو یقیناً مسلمانوں کی ایمانی تقویت کا باعث ہے۔ یہود و نصاریٰ کی گمراہی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے انبیاء کرام کو خدا اور خدا کا بیٹا بنا لیا تھا۔ شرک فی الذات جیسے گناہ کبیرہ کی وجہ سے یہ قومیں گمراہ ہو گئیں۔ لیکن اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس اعتراف کے باوجود کہ رسول اللہ ﷺ تمام مخلوق میں سب سے افضل ہیں اور مقام و مرتبہ کے اعتبار سے مخلوق میں سے کوئی بھی آپ ﷺ کی گرد راہ کو بھی نہیں پا سکا، لیکن پھر بھی وہ ان عوارض کا شکار ہوئے جن سے عام لوگوں کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اس حدیث میں اہل ایمان کے لئے نصیحت آموزی کا یہ پہلو کسی طور فائدے سے خالی نہیں ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح آپ ﷺ کی شخصیت میں غلو کر کے ان کو مقام الوہیت پر فائز کرنے کی جسارت نہ کریں ورنہ وہ بھی دوسری قوموں کی طرح گمراہی کا شکار ہو جائیں گے۔

اب ہم دوسرے اور اصل اعتراض کی طرف آتے ہیں کہ اگر نبی ﷺ پر جادو کی اثر پذیری کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے وحی میں اشتباہ و التباس لازم آتا ہے۔ یہ اعتراض بھی اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا کیونکہ شارحین حدیث اور سیرت نگاروں نے دلائل کی روشنی میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ آپ ﷺ پر جادو کے یہ اثرات صرف دنیاوی معاملات تک محدود تھے، وحی یا دعوت دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نقطہ نظر کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دین کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے:

﴿انَّا نحنُ نزَّلنا الذِّکرَ وانَّا لهٗ لحافظون﴾ (الحجر، ۱۵:۹)

''ہم نے اس ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

حافظ ابن قیمؒ (م ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

"وکان غایة هذا السحر فیه أنما هو فی جسده، وظاهر جوارحه، لا علی عقله وقلبه، ولذالک لم یکن یعتقد صحة مایخیل الیه: من أتیان النساء، بل یعلم أنه خیال لا حقیقة له، ومثل هذا قد یحدث من بعض الأمراض"(14)

''اس جادو کا اثر محض آپ کے جسم اور ظاہری اعضا پر ہوا تھا نہ کہ آپ کے دل اور آپ کی عقل پر۔ اسی وجہ سے آپ کو اپنے بعض خیالات مثلاً بیوی کے پاس جانے کا یقین نہیں ہوتا تھا بلکہ آپ جانتے تھے کہ یہ محض خیال ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس طرح کی کیفیت بعض امراض کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی ہے۔''

قابل غور بات یہ ہے کہ آپ ﷺ تبلیغ دین میں محفوظ و معصوم تھے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر آپ ﷺ پر جادو ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ ﷺ وحی اور تبلیغ دین میں معصوم اور محفوظ عن الخطاء نہ تھے تو جادو کے علاوہ بھی یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جو وحی آپ ﷺ پر نازل ہوئی اس میں آپ ﷺ سے بھول چوک بھی ہوئی ہوگی اور آپ ﷺ اس کے بیان کرنے میں مغالطے کا شکار بھی ہوئے ہوں گے۔ جب عام حالات میں خطا اور نسیان کا احتمال ہے تو جادو ہو جانے سے بھلا اس میں کیا فرق پیدا ہوا۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تبلیغ دین میں آپ ﷺ معصوم تھے تو یہی دلیل جادو کی صورت میں بھی دینی امور میں آپ ﷺ سے غلطی سرزد ہونے سے مانع ہے۔ امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں:

"أما النسیان والسهو فلاخلاف فی جوازه علیهم فیما یخصهم من العبادات، ولا خلاف فی عصمتهم فیما یتعلق بتبلیغ الشرع والرسالة، فانهم کلفوا تصدیقه جزما ولا یمکن التصدیق مع التجویز الغلط"(15)

ان عبادات میں جو انبیاء کے ساتھ خاص ہیں ان کے نسیان و سہو کے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اسی طرح شرعی احکام کی تبلیغ اور رسالت سے متعلق امور میں انبیاء کے معصوم ہونے میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے، اس لیے کہ انبیاء کو امور دین حتمی طور پر صحیح پہنچانے کا مکلف بنایا گیا ہے، اور غلطی کے جواز کی صورت میں مکمل سچائی اور صحت کے ساتھ ان امور کا پہنچانا ممکن نہیں''

قرآن مجید کی متعدد آیات اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ سے بھول ہو سکتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

﴿قال لاتؤاخذنی بما نسیتُ ولا ترھقنی من امری عسرا﴾

(الکہف، ۱۸:۷۳)

''انہوں نے کہا میری بھول پر میرا مواخذہ نہ کیجیے اور میرے ساتھ اس کام میں سختی نہ کیجیے۔''

نیز ارشاد فرمایا:

﴿فلمّا بلغا مجمع بینهما نسیا حوتهما﴾ (الکہف، ۱۸:۶۱)

''جب موسیٰؑ اور ان کا ساتھی دونوں دریاؤں کے سنگم پر پہنچے تو وہ اپنی مچھلی بھول گئے۔''

بھول چوک انبیاء کی فطرت کا حصہ ہے۔ ابو البشر حضرت آدمؑ سے بھی بھول ہوئی، قرآن مجید میں ہے:

﴿ولقد عهدنا الٰی ادم من قبل فنسی ولم نجد له عزما﴾ (طٰہٰ، ۲۰:۱۱۵)

''اس سے پہلے ہم نے آدمؑ سے عہد لیا لیکن وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا کوئی عزم نہیں پایا۔''

گویا بھول اولاد آدم کو وراثت میں ملی ہے لیکن یہ چیز منصب نبوت کے منافی نہیں ہے۔ خیر البشر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی بھول سے محفوظ نہ تھے۔ ارشاد ہے:

﴿سنقرئک فلا تنسٰی الا ماشاء اللّٰه﴾ (الاعلیٰ، ۸۷:۶-۷)

''(اے نبی ﷺ) ہم تمہیں سکھائیں گے پھر تم نہ بھولو گے، مگر وہ چیز جو اللہ

جاتا ہے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا:

"لقد أذكرني آية كنت أنسيتها"(16)

"میں ایک آیت بھول گیا تھا اس شخص نے مجھے یاد دلا دی۔"

کئی متواتر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بار ہا نبی ﷺ اپنی نماز میں بھول گئے اور فرمایا:

"انما أنا بشر مثلكم، أنسى كما تنسون، فاذا نسيت فذكروني"(17)

"بلاشبہ میں بھی ایک بشر ہوں، میں بھی بھول جاتا ہوں جیسے تم بھول جاتے ہو۔
جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد کرا دو۔"

ابو شہبہ اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فللرسول اعتباران اعتبار كونه بشرا، واعتبار كونه رسولا، فبالاعتبار الاول يجوز عليه مايجوز على سائر البشر ومنه أن يسحر، وبالاعتبار الثاني لايجوز عليه ما يخل بالرسالة لقيام الدليل على العصمة منه"(18)

"پیغمبر کی دو حیثیتیں ہیں۔ایک انسان ہونے کی اور دوسری رسول ہونے کی۔ پہلی حیثیت کے تحت اس کو وہ تمام عوارض لاحق ہو سکتے ہیں جو کسی بھی انسان کو پیش آسکتے ہیں۔جادو بھی انھی میں سے ہے۔البتہ دوسری حیثیت سے آپ کو کسی ایسے عارض کا لاحق ہونا ناممکن ہے جس سے آپ کے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں خلل واقع ہو،اس لیے کہ اس معاملے میں آپ کے معصوم ہونے کی دلیل موجود ہے۔"

جب بھول چوک انبیاء اور نبی کریم ﷺ کے لئے ثابت ہے تو جو اعتراض جادو کے متعلق کیا جاتا ہے وہ بھول کے متعلق بھی کیا جاسکتا ہے۔اس لئے درست بات یہی ہے کہ آپ ﷺ کو بھی عام انسانوں کی طرح زندگی کی مشکلات اور عوارض کا سامنا کرنا پڑا،تاہم وحی اور دین کی دعوت میں آپ ﷺ مکمل طور پر اللہ کی حفاظت میں تھے،معصوم اور محفوظ عن الخطاء تھے۔

امام ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کہتے ہیں:

"قال الامام المازري أنكر بعض المبتدعة هذا لحديث وزعموا

أنه يحط منصب النبوة ويشكك فيها، قالوا وكل ما أدى الى ذالك باطل، وزعموا أن تجويز هذا يعدم الثقة بما شرعوه من الشرائع اذ يحتمل على هذا أن يخيل اليه أنه يرى جبريل وليس هو ثم، وأنه يوحى اليه ولم يوح اليه بشئ، قال المازريؒ وهذا كله مردود، لأن الدليل قد قام على صدق النبي ﷺ فيما يبلغه عن الله تعالىٰ وعلى عصمته في التبليغ، والمعجزات شاهدات بتصديقه، فتجويز ما قام الدليل على خلافه باطل، وأما مايتعلق ببعض أمور الدنيا التي لم يبعث لأجلها ولا كانت الرسالة من أجلها فهو في ذالك عرضة لما يعترض البشر كالأمراض، فغير بعيد أن يخيل اليه في أمر من أمور الدنيا مالا حقيقة له مع عصمته عن مثل ذالك في أمور الدين."(19)

"امام مازریؒ فرماتے ہیں کہ بعض اہل بدعت نے اس حدیث کا انکار کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس سے منصب نبوت کی تحقیر اور اس میں شکوک وشبہات کا پیدا ہونا لازم آتا ہے،اور اس طرح کی ہر بات باطل ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اس بات کو مان لینے سے انبیا کے بیان کردہ شرعی احکام پر بھی اعتماد ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے انھیں محض اپنے تخیل میں جبریل نظر آیا ہو حالانکہ حقیقت میں وہ موجود نہ ہو،اور انھیں وہم ہوا ہو کہ وحی آئی ہے حالانکہ ایسا معاملہ نہ ہو۔امام مازریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض بے بنیاد ہے کیونکہ اس بات پر دلیل قائم ہے کہ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام پہنچاتے ہیں، اس میں آپ صادق ہیں اور تبلیغ دین کے معاملے میں آپ کو عصمت حاصل ہے۔ نیز آپ کے صادق ہونے پر معجزات بھی گواہ ہیں۔پس جس چیز کے حق میں دلیل موجود ہے،اس کے برعکس احتمال کو ماننا باطل ہے۔باقی رہا دنیوی امور کا معاملہ جن کے لیے آپ ﷺ کی بعثت ہی نہیں ہوئی اور جو رسالت کا مقصود بھی نہیں ہیں،تو ان میں آپ ﷺ پر بھی وہ عوارض آسکتے ہیں جو تمام انسانوں پر آتے ہیں،جیسے بیماری وغیرہ۔پس یہ بات عین ممکن ہے کہ دنیا کے

کسی معاملے میں آپ ﷺ کو کوئی ایسا خیال آجائے جس کی کوئی حقیقت نہ ہو، لیکن دین کے معاملات میں آپ ﷺ اس سے معصوم ہیں۔۔۔"

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۹۷۹ء) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضور ﷺ پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ ﷺ گھلے چلے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا۔ اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے۔ اور بعض اوقات آپ ﷺ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپ ﷺ کی ذات تک محدود رہے، حتیٰ کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ آپ ﷺ پر کیا گزر رہی ہے۔ رہی آپ ﷺ کے نبی ہونے کی حیثیت، تو اس میں آپ ﷺ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہیں ہونے پایا۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں آپ ﷺ قرآن کی کوئی آیت بھول گئے ہوں، یا کوئی آیت آپ ﷺ نے غلط پڑھ ڈالی ہو۔ یا اپنی صحبتوں میں اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں آپ ﷺ کی تعلیمات کے اندر کوئی فرق واقع ہو گیا ہو۔ یا کوئی ایسا کلام وحی کی حیثیت سے پیش کر دیا ہو جو فی الواقع آپ ﷺ پر نازل نہ ہوا ہو یا نماز آپ ﷺ سے چھوٹ گئی ہو اور اس کے متعلق بھی کبھی آپ ﷺ نے سمجھ لیا ہو کہ پڑھ لی ہے مگر نہ پڑھی ہو۔ ایسی کوئی بات معاذ اللہ پیش آجاتی تو دھوم مچ جاتی اور پورا ملک عرب اس سے واقف ہو جاتا کہ جس نبی کو کوئی طاقت چت نہ کر سکی تھی اسے ایک جادوگر کے جادو نے چت کر دیا۔ لیکن آپ ﷺ کی حیثیت نبوت اس سے بالکل غیر متاثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی میں آپ ﷺ اپنی جگہ محسوس کر کے پریشان ہوتے رہے۔" (20)

گویا رسول ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس سے کسی ایسے فعل کا صدور نہ ہو جو اس کے منصب تبلیغ و رسالت کے خلاف ہو۔ اور اس کی دعوتی سرگرمیوں میں رکاوٹ کا باعث ہو۔ اس نقطہ نظر سے اگر رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ جادو کے باوجود آپ ﷺ سے ایسا کوئی عمل سرزد نہیں ہوا، جس کی زد آپ ﷺ کے منصب رسالت پر پڑتی ہو۔

الغرض اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے صادر ہونے والے افعال کی تین اقسام ہیں۔

پہلی قسم میں آپ ﷺ کے وہ دینی امور، قلبی اذکار اور اسی قسم کے دوسرے امور داخل ہیں جو آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہوں یہ وہ افعال ہیں جنہیں آپ ﷺ اس لیے نہیں کرتے تھے کہ لوگ ان میں آپ ﷺ کی اتباع کریں ان میں آپ ﷺ دوسرے انسانوں کی مثل ہیں اس لیے ان میں سہو اور غلطی کا امکان ہے۔

دوسری قسم میں آپ ﷺ کے وہ تبلیغی افعال شامل ہیں جن سے آپ ﷺ کا مقصد امت کو تعلیم دینا ہو، جن کو آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ عملی طور پر کیا ہو یا پہلی مرتبہ ان کا حکم بیان فرمایا ہو اور اس سے پہلے آپ ﷺ نے کبھی ان افعال کی تبلیغ نہ کی ہو، ایسے افعال میں آپ ﷺ سہو اور غلطی کرنے سے بلاشبہ معصوم ہیں۔

تیسری قسم ان تبلیغی افعال کی ہے جن سے آپ ﷺ کا مقصد امت کو تعلیم دینا ہو لیکن ان افعال کو اس سے قبل آپ ﷺ نے بار بار کیا ہو یہاں تک کہ وہ امت کے نفوس میں راسخ ہو گئے ہوں اور ان افعال کے کرنے سے اس وقت آپ ﷺ کا مقصود دوسرے لوگوں کی طرح محض عبادت ہو۔ صحیح قول کے مطابق ایسے افعال میں آپ ﷺ سے سہو اور خطا کا امکان ہے، کیونکہ ان افعال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نئے حکم کی تعلیم دینا مقصود نہیں ہوتا اس لیے معجزہ کی دلالت سے ان کا تعارض بھی نہ ہوگا۔ اس لیے غلطی کی نشاندہی کے بعد آپ ﷺ اس کا جو صحیح حکم بیان کریں گے وہ ابتدائی بیان شمار کیا جائے گا اور اس میں سہو کا امکان نہ ہوگا اور اب غلطی کی درستی کے بعد اس کا شمار بھی دوسری قسم کے افعال میں ہی ہوگا۔

حوالہ جات

(1) بنی اسرائیل، ۱۷: ۴۷-۴۸
(2) بخاری، کتاب الطب، باب السحر، ح: ۵۷۶۶، ص: ۱۲۳۷، ۱۲۳۸
ایضاً، رقم: ۳۲۶۸، ۳۱۷۵، ۵۷۶۳، ۵۷۶۵، ۶۰۶۳، ۶۳۹۱
مسلم، کتاب السلام، باب السحر، ح: ۵۷۰۳، ص: ۹۷۱
ابن ماجہ، کتاب الطب، باب السحر، ح: ۳۵۴۵، ص: ۵۱۰
(3) احکام القرآن، ۱/ ۴۹، (سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۰۰ھ)

(4) تفسیر کبیر، ۹۲۶/۱، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ء)

(5) فی ظلال القرآن، تفسیر سورۃ الفلق، ۱۱۷/۶-۲، (ادارہ منشورات اسلامی، ملتان روڈ، لاہور، ۱۹۹۸ء)

(6) مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت ، ۹۳/۲، (الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ، کراچی، ۱۹۸۹ء)

(7) صحیح بخاری کا مطالعہ ، ۸۶/۲-۸۷، (فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز، سیر تھ، انڈیا، ۲۰۰۲ء)

(8) مقام حدیث، ص:۱۹۹، (ادارہ طلوع اسلام 25/بی گلبرگ، لاہور، 2001ء)

(9) اسلام کے مجرم، ص:۹۸، (گلیکسی پبلی کیشنز، ملتان، بلوریہ)

(10) مقالات سرسید، مقالہ بعنوان ''سحر''، (مرتب: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی)، ۳۰۶/۳-۳۰۹، (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء)

(11) زاد المعاد، فصل غزوۃ بنی النضیر، ۲۱۵/۳

(12) الطب النبوی، ص:۹۸، (دار الفکر، بیروت،)

(13) فتح الباری، کتاب الطب، باب السحر ، ۲۲۷/۱۰

(14) الطب النبوی، ص:۱۰۰، (دار الفکر، بیروت،)

(15) المستصفیٰ من علم الاصول، ۲۱۸/۲، (تحقیق: الدکتور محمد سلیمان الاشقر، موسسۃ الرسالۃ، الریاض، ۱۹۹۷ء)

(16) مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب الامر بتعهد القرآن، ح:۱۸۳۸، ص:۳۱۹

(17) مسلم، کتاب المساجد، باب سجود التلاوۃ والسجود له، ح:۱۲۷۳، ص:۲۳۰

(18) دفاع عن السنۃ، ص:۲۶۵، (دار اللواء للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۹۸۷ء)

(19) فتح الباری، کتاب الطب، باب السحر ۲۲۶/۱۰-۲۲۷

(20) تفہیم القرآن، ۶/ ۵۵۳-۵۵۵، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۳ء)

....

تحویل قبلہ

محمد اعظم سعیدی

مہتمم جامعہ اسلامیہ کورے وال، کراچی

ولئن اتیت الذین اوتوا الکتب بکل ایۃ ما تبعوا قبلتک ج وما انت بتابع قبلتھم ج وما بعضھم بتابع قبلۃ بعض ولئن اتبعت اھواء ھم من بعد ما جاءک من العلم انک اذا لمن الظلمین۔

ترجمہ: اور اگر آپ اہل کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانی لے کر آئیں تو بھی وہ آپ کے قبلہ کی اتباع نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں، اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں۔ اور (اے سننے والے) علم حاصل ہو جانے کے بعد اگر تو نے ان کی خواہشات کی اتباع کی تو بے شک تو بھی بے انصافوں میں سے ہوگا۔ (البقرہ آیت ۱۴۵)

یہاں بکل ایۃ سے مراد ہر قسم کی دلیل یا ہر ایک نشانی ہے یعنی آپ ان اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی قوی سے قوی تر نشانی بھی پیش کر دیں۔ یا مضبوط سے مضبوط دلائل بھی دے دیں بلکہ توریت وانجیل میں لکھا ہوا بھی ان کو پڑھوا دیں تب بھی یہ آپ کے قبلہ کو نہیں مانیں گے۔ کیونکہ دلائل و براہین اور علامات و نشانات سے شک و شبہات تو دور کیے جا سکتے ہیں مگر حسد، عناد اور ہٹ دھرمی کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے قبلہ کی عدم پیروی یہ ان کی ضد و ہٹ دھرمی ہے ورنہ یہ بات ان کی کتابوں میں موجود ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا گھر بیت اللہ شریف ہے اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے اور جو مبعوث ہونے والا نبی ہے وہ ملت ابراہیمی کا پیروکار ہوگا اور ذو قبلتین ہوگا۔

قبلہ کے لفظی معنی ہیں، سمت توجہ، جس طرف رخ کیا جائے (معارف القرآن ج ا سورۂ بقرہ زیر آیت ۱۴۲)

القبلۃ۔ بالمقابل آدمی کی حالت کو کہا جاتا ہے اور عرف میں اس جہت کو قبلہ کہا جاتا ہے جس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی جاتی ہے (مفردات امام راغب مترجم محمد عبدہ فیروز پوری ج ۲ ص ۸۲۵)

قبلہ۔ بروزن فعلہ، سامنے کی چیز یا سامنے کی جہت، یا اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی کے سامنے ہونے سے پیدا ہو، اسی لیئے پیشوائی کرنے کو استقبال اور دشمن کے سامنے آنے کو مقابلہ کہتے ہیں۔ قبلہ کو قبلہ اسی لیئے کہتے ہیں کہ وہ نمازی کے سامنے ہوتا ہے (کبیر روح البیان بحوالہ تفسیر نعیمی سورہ بقرہ زیر آیت ۱۴۲)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ولکل وجھۃ ھو مولیھا (ہر ایک کے لیئے ایک سمت ہے جسکی طرف وہ منہ کرتا ہے۔ بقرہ آیت ۱۴۸) یعنی ہر ایک کے لیئے ایک قبلہ ہے جسکی طرف منہ کر کے وہ نماز ادا کرتے ہیں جیسے حاملین عرش یعنی مقربین ملائکہ کا قبلہ عرش اعظم ہے، روحانیین یعنی ملائکہ بررہ کا قبلہ کرسی ہے، کروبیون یعنی ملائکہ سفرہ کا قبلہ بیت المعمور ہے۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت موسیٰ علیہما السلام تک جملہ پیغمبروں کا قبلہ بیت اللہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اکثر انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس تھا جبکہ حضور اکرم ﷺ کا قبلہ بیت اللہ ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۷۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت آدم علیہ السلام کو جب دنیا میں اتارا گیا تو فرشتوں کے ذریعے بیت اللہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی اسی طرف قرآن مجید نے یہ اشارہ فرمایا ہے۔ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبرکا (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیئے بنایا گیا مکہ میں وہ بہت ہی برکت والا ہے۔ القرآن)

پھر آدم علیہ السلام نے پانچ مختلف پہاڑوں یعنی طور سینا، طور زیتا، کوہ جودی، کوہ لبنان اور کوہ حراء سے پتھر لے کر فرشتوں کی قائم کردہ بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تھی (پھر بعد کے مختلف ادوار میں مختلف پیغمبروں سے نسبت پا کر یہ پہاڑ بھی دائمی عظمت سے مشرف ہو گئے، طور سینا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہوا۔ کشتی نوح علیہ السلام کوہ جودی پر رکی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے مصر جاتے ہوئے کوہ لبنان پر قیام کیا تو کوہ حرا حضور اکرم ﷺ کا مرکز گوشہ نشینی تھا)۔

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک (بقول صاحب تفسیر نعیمی آدم سے موسیٰ علیہما السلام تک) تمام پیغمبروں اور ان کی امتوں کا قبلہ بھی بیت اللہ شریف رہا۔ طوفان نوح میں بیت اللہ کی دیواریں منہدم ہو گئی تھیں۔ پھر عرصہ دراز بعد حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہی بنیادوں پر اسکی دوبارہ تعمیر فرمائی اور یہی آپ کا اور آپ کی ملت کا قبلہ رہا۔

جب قریش مکہ نے نئے سرے سے انہی قدیم بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر شروع کی تھی تو اس

وقت حضور اکرم ﷺ بھی اس تعمیر میں شریک تھے اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے پھر اس میں حجر اسود کی تنصیب بھی آپ کے دست مبارک سے ہوئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے عہد نبوت و سلطنت میں جنات سے بیت المقدس تعمیر کروایا تھا چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے بعد اکثر انبیائے بنی اسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا جبکہ آپکے والد حضرت داؤد علیہ السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا۔

معارف قرآن کی ایک تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی تھا حالانکہ صالح علیہ السلام کی مسجد بیت المقدس کے قریب ایک پہاڑ پر واقع تھی مگر اس مسجد کی سمت قبلہ بیت اللہ کی جانب تھی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی صخرۂ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے (صخرہ وہ پتھر ہے جو بیت المقدس میں مغربی جانب لٹکا ہوا ہے) مگر آپ کا رخ بیت اللہ کی طرف ہی ہوتا تھا۔ (ملخصاً معارف القرآن ج ۱ ص ۳۷۵)

یہودیوں نے بیت المقدس کی مغربی سمت کو اپنا قبلہ بنایا ہوا تھا اس لیئے کہ حضرت موسیٰ کو مغرب کی جانب سے ندا آئی تھی جیسا کہ قرآن میں ہے وما کنت بجانب الغربی اذ قضینا الی موسی الامر (اور نہیں تھا تو مغرب کی طرف جب بھیجا ہم نے موسیٰ کی طرف حکم۔ سورۃ القصص آیت ۴۴) جبکہ عیسائیوں نے بیت المقدس کے اس شرقی حصہ کو قبلہ بنایا ہوا تھا جہاں سے حضرت جبرائیل علیہ السلام، حضرت بی بی مریم کے پاس انسانی شکل میں بچے کی بشارت دینے گئے تھے قرآن مجید میں اسی طرف واضح اشارہ دیا گیا ہے واذکر فی الکتب مریم اذ انتبذت من اھلھا مکانا شرقیا (اور ذکر کر کتاب میں مریم کا جب جدا ہوئی اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان میں۔ سورۂ مریم آیت ۱۶)

خلاصہ یہ کہ بیت المقدس کا مغربی حصہ یہودیوں کا قبلہ تھا اور مشرقی حصہ عیسائیوں کا قبلہ تھا یعنی بیت المقدس کی شرقی و مغربی سمتیں ان کا قبلہ تھیں۔

مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ شریف کو بنایا گیا، کیونکہ یہ عبادت کے لیئے پہلا گھر ہے جسے لوگوں کے لیئے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے مکہ میں حضرت نوح و حضرت آدم اور ملائکہ کی رکھی گئی بنیادوں پر تعمیر فرمایا تھا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبرکا (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیئے بنایا گیا مکہ میں وہ بہت ہی برکت والا ہے۔ القرآن)۔ نیز یہی بیت اللہ خود حضرت ابراہیم اور ان کی ملت کا قبلہ بھی تھا، حضرت اسماعیل کا قبلہ بھی یہی تھا۔ وہ انبیائے بنی اسرائیل کہ جن کا قبلہ بیت المقدس تھا وہ بھی حج کے لیئے بیت اللہ ہی آتے تھے، کیونکہ یہ کعبہ اللہ تعالیٰ کا

حرم ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے جعل الله الکعبة البیت الحرام (اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو عزت والا گھر بنایا ہے۔ القرآن) مزید امتیاز یہ کہ یہ بابرکت شہر حضور اکرم ﷺ کا مولد اور مقام بعثت بھی ہے اور یہ وسط زمین میں ہے جبکہ امت محمدیہ کو اللہ تعالیٰ نے امت وسط قرار دیا ہے اس لیئے بیت اللہ مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔

تحویل قبلہ

اسی آیت کے ضمن میں تحویل قبلہ پر گفتگو بھی ضروری ہے کیونکہ اس حوالے سے تین نظریات ہمارے سامنے ہیں ایک یہ کہ نماز فرض ہونے کے بعد مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس قرار دیا گیا پھر ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی سترہ ماہ تین دن تک بیت المقدس میں قبلہ رہا آخر ۱۵ رجب بروز پیر یا ۱۵ شعبان بروز منگل ۲ھ کو ظہر یا عصر کی نماز میں بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا۔ یعنی تحویل قبلہ ایک مرتبہ ہوئی، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ مقرر رہا ہجرت کے بعد جیسے ہی آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو ۱۲ ربیع الاول کو ہی بیت المقدس کو مسلمانوں کا قبلہ بنادیا گیا۔ سترہ ماہ تین دن بعد پھر بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنادیا گیا یعنی تحویل قبلہ دو مرتبہ ہوئی۔ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ مکہ میں یا مدینہ میں بیت المقدس کبھی مسلمانوں کا قبلہ نہیں رہا۔ قرآن میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم نہ صراحتہً ہے نہ اشارۃً ہے۔

نیز یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ خود صحابہ کرام اور پھر تابعین عظام میں بھی اس بارے میں اختلاف ہے کہ جب مکہ میں نماز فرض ہوئی تو اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا یا بیت المقدس؟ صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر ۱۲ ربیع الاول کو مدینہ تشریف لائے تو آپ نے تقریباً سترہ ماہ تین دن تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی مگر اس عرصہ میں آپ کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ بیت اللہ شریف آپ کا قبلہ ہو جائے (صحیح بخاری ج ا ص ۱۰، ۱۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی) اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں بھی اور ہجرت کے بعد سترہ مہینے تک مدینہ منورہ میں بھی حضور اکرم ﷺ کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ پھر آپ کو منجانب اللہ، بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا (عمدۃ القاری ج ا ص ۲۳۰ میں ہے علامہ بدرالدین عینی اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں البتہ مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ کا عمل اس طرح رہا کہ آپ ﷺ حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے۔ (باضافہ الفاظ وملخصاً تبیان القرآن ج ا ص ۵۹۳)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ نماز فرض ہونے کے ساتھ ہی حضور اکرم ﷺ کو ان کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا اور ہجرت تک بیت اللہ ہی آپ کا قبلہ رہا۔ ہجرت کر کے جب آپ مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کی تالیف قلب کے لیئے (تاکہ وہ اسلام قبول کرلیں) آپ نے اپنے اجتہاد سے یا اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیار سے یا بقول حضرت ابن عباس بذریعہ وحی سترہ ماہ تین دن تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھیں۔ پھر آپ ﷺ کی خواہش پر ۱۵ شعبان ۲ھ بروز منگل تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا۔ حافظ ابن عبدالبر اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں (باضافہ الفاظ وملخصاً از تبیان القرآن ج ا ص ۵۹۳)

جس طرح علامہ بدرالدین عینی حضرت ابن عباس کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اسی طرح علامہ غلام رسول سعیدی زاداللہ عمرہ بھی حضرت ابن عباس کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ مکہ میں آپ کا قبلہ کعبہ تھا تو پھر دوبار قبلہ کا منسوخ ہونا لازم آئے گا اسلیئے محققین کا یہ نظریہ ہے کہ آپ ابتداءً مکہ مکرمہ میں بھی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ (تبیان القرآن ج ا ص ۵۹۳)

البتہ دوسرا قول کہ جسے حافظ ابن عبدالبر ترجیح دیتے ہیں اسکے قائلین یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن تو اس معاملے میں خاموش ہے حضرت ابن عباس نے جس آیت کو اپنی دلیل بنایا ہے وہ یہ ہے وما جعلنا القبلة التی کنت علیها الا لنعلم من یتبع الرسول (وہ قبلہ کہ جس پر آپ پہلے تھے اسکو ہم نے اسلیئے قبلہ مقرر کیا تھا تاکہ ہم ظاہر کریں کہ کون رسول ﷺ کی اتباع کرتا ہے۔ سورۃ بقرہ آیت ۱۴۳) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ مسلمانوں کے لیئے امتحان و آزمائش تھا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کون رسول کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون پھسلنے والا ہے تو یہ اظہار مدینہ میں ہوا کہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوتے ہی بعض ضعیف الایمان اور کچھ منافقین یہ الزام لگا کر کہ آپ اپنی قوم کے دین (قبلہ) پر پلٹ گئے ہیں وہ اسلام سے پھر گئے تھے۔ اگر مکہ میں بیت المقدس قبلہ رہا ہوتا تو منافقین یہ نہ کہتے کہ آپ اپنی قوم کے قبلہ پر پلٹ گئے ہیں، نیز اس آیت میں پہلے قبلہ کو ہی دوبارہ قبلہ بنانے کا حکم ہے، اگر مکہ میں پہلے قبلہ بیت المقدس تھا تو کیا مدینہ میں پھر سے اسے دوبارہ قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا تھا؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں، بلکہ مکہ میں پہلا قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔ مدینہ میں اپنے اجتہاد و اختیار سے بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا پھر دوبارہ آپ کی خواہش پر اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو قبلہ مقرر فرمایا۔

علاوہ ازیں مدینہ میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا پس منظر مدینہ کے اہل کتاب کی تالیف

قلب تھا اور موافقت قبلہ کے باعث ان کے اسلام کی طرف مائل ہونے کی توقع تھی، اسی پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو پھر مکہ میں قبائل حجاز کی تالیف قلب کے لیے بیت اللہ کو قبلہ بنایا جانا اظہر من الشمس ہے کیونکہ قبائل عرب کم از کم زبان سے اپنے ملت ابراہیم ہونے کا اقرار کرتے تھے، اور ان کی پیروی کے مدعی بھی تھے اور کچھ تو اپنے آپ کو حنفاء ہی کہتے تھے خود حضور اکرم ﷺ بھی اعلان نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملت ابراہیمی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔ اعلان نبوت اور نزول وحی کے بعد قرآن مجید نے بھی آپ کی شریعت کو ملت ابراہیم کے مطابق قرار دیا اور آپ کے دین کو دین حنیف کا نام دیا گیا۔ پھر حضرت ابراہیم و اسماعیل کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ اسلیئے مکہ میں نماز فرض ہونے کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانا فطرت کے عین مطابق تھا اور قابل ترجیح بھی ہے اور آیت قرآن وما جعلنا القبلة التي كنت عليها (القرآن) اس پر دلیل ہے کہ اب ہم نے بیت المقدس کی جگہ آپ کے اسی پہلے قبلہ بیت اللہ کو ہی دوبارہ آپ کو قبلہ بنا دیا ہے۔ نیز توریت میں بھی مبعوث ہونے والے نبی کی ایک صفت کا بیان کی گئی ہے کہ وہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا (تبیان القرآن ج ۱ ص ۶۱۳) اگر نماز فرض ہونے کے بعد آپ ﷺ کا قبلہ بیت المقدس مقرر ہوا تھا تو پھر توریت کی مذکورہ پیش گوئی کی کیا تاویل کی جائے گی؟ بہر حال دوسرے نظریہ کے قائلین کے دلائل مضبوط ہیں۔

تیسرا مکتۂ نظر یہ ہے کہ تحویل قبلہ کا عمل کبھی ہوا ہی نہیں اس لیئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان اول بيت وضع للناس للذي ببكة مبركا (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیئے بنایا گیا مکہ میں وہ بہت ہی برکت والا ہے۔ القرآن)۔ لہذا حضرت آدم علیہ السلام سے قیامت تک یعنی روز اول تا روز آخر بھی بیت اللہ ہی قبلہ ہوگا، نیز آیت کریمہ واذ بوانا لابراهيم مكان البيت (اور جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ بتادی۔ سورۂ حج آیت ۲۶) اس میں اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں تشریف لانے سے پہلے بیت اللہ موجود تھا اس سے اگلی آیت میں اس اعلان کی تاثیر یہ بتائی گئی ہے يأتوك رجالا على كل ضامر يأتين من كل فج عميق۔ (سورۂ حج آیت ۲۷) یہ سلسلہ ہزار ہا سالوں سے آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہیگا یعنی جب سے لوگ حج بیت اللہ کے لیئے آرہے ہیں اور آتے رہینگے اس وقت تک (قیامت تک) بیت اللہ ہی قبلہ رہے گا۔ اسی طرح جب سے بیت اللہ کی بنیاد رکھی گئی ہے تب سے قیامت تک بیت اللہ ہی قبلہ رہے گا۔

نیز ما ولهم اور فلنولينك کا معنی تحویل نہیں ہے بلکہ اس کا لغوی معنی تولیت میں دینا ہے جیسا کہ ۔۔۔ الولاءُ والتوالی کے اصل معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح کے بعد

دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو، پھر استعارہ کے طور پر قرب کے معنی میں استعمال ہونے لگا خواہ وہ قرب بلحاظ مکان یا نسب ہو یا دوستی و نصرت کے ہو یا بلحاظ اعتقاد ہو۔۔۔ الولاية (بکسر الواو) کے معنی نصرت اور الولاية (بفتح الواو) کے معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔۔۔۔ بعض نے کہا کہ یہ دلالة اور دلالة کی طرح ہے اس میں دو لغت ہیں اور اس کے معنی ہیں کسی کام کا متولی ہونا، کما قال ابوعبیدہ فی مجازہ (مفردات امام راغب مترجم محمد عبدہ فیروز پوری ج ۲ ص ۱۱۳۰)

تولی۔۔ کا لفظ جب متعدی بنفسہ ہوتا ہے تو اس معنی قریب ترین مقام کی ولایت کا حصول ہوتا ہے (مفردات مترجم محمد عبدہ فیروز پوری ج ۲ ص ۱۱۳۲)

لغت کے مذکورہ حوالوں سے ولهم اور فلنولينك کا معنی ہوا کہ۔۔۔۔ ہم نے آپ کو نگران یا ولی بنایا۔ اور۔۔ پس ہم آپ کو متولی بنا دینگے۔۔۔۔ اور اس معنی کی دلیل یہ آیات مبارکہ ہیں ما لكم من ولايتهم من شيء حتى يهاجروا (جب تک وہ ہجرت نہ کریں تمہیں ان کی قربت و تولیت کا کوئی حق نہیں ہے۔) دوسری آیت یہ ہے انما سلطانه على الذين يتولونه (وہ انہی لوگوں پر سلطان (طاقتور) ہے جو اسے اپنا متولی یا دوست بناتے ہیں) ایک اور آیت ہے ان اولى الناس بابراهيم للذين اتبعوه (بے شک ابراہیم سے قرب رکھنے والے وہی لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں) ان تینوں آیات سے واضح ہوا کہ ولهم اور فلنولينك کا معنی تحویل یا پھیرنا نہیں ہے بلکہ متولی بنانا ہے۔ اب آیت کریمہ فلنولينك قبلة ترضها کا ترجمہ یہ ہوگا (پس ہم نے آپ کو اسی قبلے کا متولی بنا دیا ہے جس پر آپ راضی ہیں)۔

ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے جا کر جب آپ نے بیت اللہ کو قبلہ بنایا تو مدینہ کے یہود و نصاریٰ نے کہا کہ جب آپ ہمارے نبی کو، ہماری شریعتوں اور کتابوں کو (ان کی اسی اصلی حالت میں جیسا کہ وہ نازل ہوئی تھیں) مانتے ہیں تو پھر چاہیے کہ قبلہ بھی ہمارا ہی اختیار کریں، ہمارا قبلہ تو بیت المقدس ہے ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا سيقول السفهاء من الناس ما ولهم عن قبلتهم التي كانوا عليها (عنقریب بے وقوف لوگ کہیں گے انہیں ان کے قبلے کا متولی کس نے بنا دیا کہ جس پر وہ پہلے تھے۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۴۲) یعنی مدینہ میں بھی آپ ﷺ کا قبلہ بیت اللہ ہی تھا جس پر وہاں کے یہود و نصاریٰ نے اعتراض کیا تھا۔

مزید یہ کہ تحویل قبلہ کے مسئلے کو سمجھنے کے لیئے سورۂ فیل اور سورۂ قریش کو سمجھنا ضروری ہے

کیونکہ یہ دونوں سورتیں مکہ کے ابتدائی دور کی ہیں اور نزول کے اعتبار سے ان کا شمار ۱۹ اور ۲۰ ہے ان میں قریش کو یاد دلایا جارہا ہے کہ تمہاری عزت، عظمت اور دنیاوی شوکت و وجاہت، نیز تمہارا امن و سکون سے رہنا و دیگر قبائل عرب کا تم سے نہ لڑنا، شام و یمن کے سفروں میں تمہارے تجارتی قافلوں کا ڈاکوؤں، لٹیروں سے محفوظ رہنا، بھوک و قحط سالی میں تمہیں کھانا ملنا اور خوف کے ایام میں امن سے رہنا اسلیئے تھا کہ تم بیت اللہ کے متولی تھے، پھر ابرہہ کے لشکر کے مقابلے سے تم عاجز تھے آخر اللہ نے ہی مافوق العادت اپنے گھر کی حفاظت فرمائی تھی اور تمہاری عزت و شوکت کو قائم رکھا تھا اور اب ہم نے اپنے محبوب پیغمبر کو اس گھر کا متولی بنا کر بھیجا ہے اور انہی کے ذریعے ہم اپنے گھر کی بتوں اور بت پرستی سے حفاظت فرمائیں گے لہٰذا مذکورہ احسانات برائے قریش مکہ فليعبدوا رب هذا البيت (تم اس کی عبادت کرو جو اس گھر کا رب ہے۔ سورۂ قریش)

اب اس میں کیا تطبیق دی جاسکتی ہے کہ مکہ کے ابتدائی دور میں اللہ تعالیٰ قریش مکہ کو تو یہ حکم فرمائیں کہ تم محمد کی دشمنی اور بتوں کی پرستش چھوڑ کر خانہ کعبہ میں، خانہ کعبہ کے رب کی عبادت کرو اور پھر خود پیغمبر اسلام کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ آپ اپنی نمازوں کے لیئے بیت المقدس کو قبلہ بنائیں؟ بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ بیت المقدس میں آپ کی مکہ و مدنی زندگی میں کبھی قبلہ نہیں رہا۔ اور قرآن مجید میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جبکہ احادیث میں بھی بیت المقدس کے قبلہ ہونے میں تضاد ہے جیسا کہ نظریہ نمبر ایک اور دو سے واضح ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ آیات واضح بتارہی ہیں کہ بیت اللہ شریف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیئے پہلا گھر ہے، جو قبلہ کی حیثیت سے قائم ہوا اور قیامت تک قائم رہے گا۔ جبکہ بیت المقدس کو عبادت کے ایک مرکز و مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں بعض انبیائے بنی اسرائیل اپنی امتوں کے ساتھ اکٹھے ہو کر عبادت کیا کرتے تھے لیکن قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔

چوتھا نکتہ نظر یہ ہے کہ مکہ میں نماز کی فرضیت کے بعد مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ تھا، مگر ہجرت سے کچھ پہلے آپ کو بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم ملا، جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں۔۔ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول علماء ابتداء آپ ﷺ کا قبلہ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانہ کعبہ ہی قرار دیا گیا۔ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے۔ (معارف القرآن ج ا ص ۳۶۲)

لطیف نکتہ۔ متعدد مفسرین کرام کے رشحات قلم کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ مکہ میں حجر اسود اور رکن

یمانی کے درمیان نماز ادا کرتے تو استقبال بیت اللہ کے ساتھ ساتھ بیت المقدس بھی رو بروے نظر ہوتا تھا۔۔ اسی طرح انبیائے بنی اسرائیل بھی (جن کا قبلہ بیت المقدس تھا) اپنی عبادتوں کا قبلہ اگرچہ بیت المقدس کو بناتے تھے مگر بیت اللہ بھی ان کے سامنے ہوا کرتا تھا چنانچہ صاحب معارف القرآن، تفسیر قرطبی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اور بقول ابو العالیہ انبیاء سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی ایسا عمل کرتے تھے کہ صخرۂ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی (معارف القرآن ج ا ص ۳۶۲)

اسی طرح مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تفسیر عزیزی اور تفسیر احمدی کے حوالے سے لکھتے ہیں: جب تک مکہ مکرمہ میں قیام رہا بیت المقدس ہی کی طرف نماز ہوتی رہی مگر کعبہ معظمہ کو سامنے لے کر یعنی بیت المقدس کی طرف اس طرح منہ کرتے کہ کعبہ معظمہ بھی سامنے آجاتا (تفسیر نعیمی سورۂ بقرہ زیر آیت ۱۴۲)

بہر حال تحویل قبلہ کے حوالے سے چاروں نکتۂ نظر تحریر کر دیئے گئے ہیں جبکہ میری ترجیح دوسرا نکتہ نظر ہے نیز موضوع سخن میں بکل ایۃ کا مفہوم یہ ہے کہ اے رسول ﷺ ہم نے آپ کو قبلہ (خانہ کعبہ) کا متولی بنادیا ہے۔ یہ اہل کتاب آپ کے قبلہ (بیت اللہ) کی پیروی نہیں کرینگے چاہے ان کو ہر قسم کی تمام نشانیاں ہی کیوں نہ دکھلادیں، جب یہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ آپس میں ایک قبلہ پر متفق نہیں ہیں تو آپ کی پیروی پر کیسے متفق ہونگے؟ اسی طرح آپ بھی انکے قبلوں کی پیروی نہیں کر سکتے کیونکہ انکے قبلے الگ الگ یعنی بیت المقدس کی مشرقی اور مغربی سمتیں ہیں، یہ سب کچھ جاننے کے بعد جو بھی یہود و نصاریٰ کی پیروی میں ان سمتوں کو قبلہ بنائے گا وہ اپنے آپ سے ناانصافی اور ظلم کرے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

....

قرآن وسنت کی عظمت واتباع نہج البلاغہ کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد شکیل اوج
استاذ الفقہ والتفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

۱۴ اگست ۲۰۰۶ء بروز پیر، اہل تشیع کے قدیم بلکہ کراچی کے اولین آفاقی مدرسے "جامعہ امامیہ" (ناظم آباد) (قائم شدہ ۱۸ جولائی سن ۱۹۵۲ء) میں نہج البلاغہ کی علمی وادبی عظمت کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی کے چیئرمین پروفیسر مولانا غلام مہدی، مولانا ظفر حسن نقوی، مولانا مشتاق حسین شاہدی، مولانا اصغر درس، پروفیسر سید سبط جعفر زیدی، اور مولانا قمر علی قمری نے اپنے اپنے انداز میں خطبات پیش کیے۔ راقم بھی اس سیمینار میں مقرر کی حیثیت سے مدعو تھا۔ سیمینار میں بتایا گیا کہ آج سے ۳۲ سال پہلے بھی اس مقام پر نہج البلاغہ کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد ہوا تھا۔ جس میں شیعہ علماء کے ساتھ اہلسنت کے نامور عالم اور جامعہ کراچی میں کلیۂ معارف اسلامیہ کے سابق رئیس پروفیسر مولانا منتخب الحق قادری مرحوم بحیثیت مقرر شریک ہوئے تھے۔ اور اب ایک طویل مدت کے بعد اسی عنوان سے ایک بار پھر کچھ علماء اور اسکالرز کو مدعو کیا گیا ہے۔ اس موقع پر راقم نے جو خطاب کیا وہ ذیل میں نذر قارئین ہے۔

معزز علمائے کرام وسامعین محترم!

جامعہ امامیہ میں، نہج البلاغہ کے تعلق سے ہونے والی تقریب میں اپنی شرکت کو میں ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔ موضوع کی مناسبت سے میں نے جو گفتگو کرنی ہے اس کا عنوان ہے "قرآن وسنت کی عظمت واتباع نہج البلاغہ کی روشنی میں"۔ نہج البلاغہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب خطبات کا ایک عظیم وادبی شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال قرآن وسنت سے اپنے خصوصی تعلق کے پیش نظر میں نے

نہج البلاغہ کے ایک ایسے ہی خطبہ کو اپنی گفتگو کے لیے منتخب کیا ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن وسنت کی عظمت کو بیان فرمارہے ہیں۔ یہ خطبہ نہج البلاغہ کی جلد اول میں موجود ہے۔ جس کا نمبر شمار ۱۰۸ ہے۔ میں اس خطبے کے آخری حصے کو یہاں بعینہٖ نقل کروں گا۔ پھر اس کا وہ ترجمہ پیش کروں گا۔ جو مولانا مفتی جعفر حسین مرحوم نے کیا ہے۔ بعدہ اس خطبہ کو اپنے ترجمہ کی زبان میں بھی پیش کروں گا۔ اصل خطبہ ملاحظہ ہو:

افیضوا فی ذکر اللّٰہ فانہ احسن الذکر، وارغبوا فیما وعد المتقین فان وعدہ اصدق الوعد، واقتدوا بھدی نبیکم فانہ افضل الھدی، واستنوا بسنتہ فانھا اھدی السنن، وتعلموا القران فانہ احسن الحدیث وتفقھوا فیہ، فانہ ربیع القلوب، واستشفوا بنورہ، فانہ شفاء الصدور، واحسنوا تلاوتہ فانہ احسن القصص، فان العالم العامل بغیر علمہ کالجاھل الحائر الذی لا یستفیق من جھلہ بل الحجۃ علیہ اعظم والحسرۃ لہ الزم وھو عنداللّٰہ الوم.

(نہج البلاغہ، جلد اول، خطبہ نمبر ۱۰۸ کا آخری حصہ، صفحہ نمبر ۳۱۶، اردو ترجمہ مولانا مفتی جعفر حسین، امامیہ کتب خانہ، مغل حویلی اندرون موچی دروازہ لاہور، اضافہ شدہ ایڈیشن، سنِ اشاعت درج نہیں)

مفتی جعفر حسین کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

اللہ کے ذکر میں بڑھے چلو، اس لیے کہ وہ بہترین ذکر ہے اور اس چیز کے خواہشمند ہو کہ جس کا اللہ نے پرہیزگاروں سے وعدہ کیا ہے اس لیے کہ اس کا وعدہ سب وعدوں سے زیادہ سچا ہے، نبی کی سیرت کی پیروی کرو کہ وہ بہترین سیرت ہے اور انکی سنت پر چلو کہ وہ سب طریقوں سے بڑھکر ہدایت کرنے والی ہے اور قرآن کا علم حاصل کرو کہ وہ بہترین کلام ہے اور اسمیں غور و فکر کرو کہ یہ دلوں کی بہار ہے اور اسکے نور سے شفاء حاصل کرو کہ سینوں (کے اندر چھپی ہوئی بیماریوں) کے لیے شفا ہے اور اسکی خوبی کے ساتھ تلاوت کرو کہ اس کے واقعات سب واقعات سے زیادہ فائدہ رساں ہیں۔ وہ عالم جو اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا اس سرگرداں جاہل کے مانند ہے جو جہالت کی سرمستیوں سے ہوش میں نہیں آتا، بلکہ اس پر (اللہ کی) حجت زیادہ ہے اور حسرت و افسوس اس کے لیے لازم و ضروری ہے اور اللہ کے نزدیک وہ زیادہ قابل ملامت ہے۔

اور اب راقم کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

قانون خداوندی کی طرف بڑھو کیونکہ یہ بہترین قانون ہے اور اس چیز کے طالب بنو جسکا متقین (یعنی غلط راہ کے خطرات سے محفوظ ہونے والوں) سے وعدہ کیا گیا ہے بلاشبہ اس کا وعدہ تمام

وعدوں سے زیادہ سچا ہے اور اپنے نبی ﷺ کی سیرت کی پیروی کرو۔ کیونکہ یہ سب سے اعلیٰ سیرت ہے۔ اور انکی سنت کو اپناؤ کیونکہ انکی سنت تمام سنتوں سے زیادہ ہدایت یافتہ اور سب سے بڑھکر ہدایت رساں ہے۔ اور قرآن کا علم حاصل کرو کیونکہ یہ بہترین کلام ہے اور اسمیں خوب فہم وبصیرت حاصل کرو، کیونکہ یہ دلوں کی بہار ہے، اور اس کے نور سے شفا حاصل کرو، کیونکہ یہ سینوں میں پیدا ہونے والی تمام بیماریوں کے لیئے شفاء ہے اور اسکی پیروی بہترین انداز سے کرو، کیونکہ اسمیں تمہارے لیئے بہترین نشانات قدم کی اتباع کا سامان موجود ہے، بے شک قرآنی علم کے سوا (کسی اور پر) عمل کرنے والا عالم اس پریشان و سرگرداں جاہل کی طرح ہے جو اپنے جہل کی مستی سے باہر نہیں نکلا۔ جبکہ (قرآن اور اسکی تعمیل) اس پر سب سے بڑی حجت ہے (اس لیئے) حسرت ویاس اس کے لیئے لازم ہے اور اللہ کے نزدیک وہ سب سے زیادہ قابل ملامت بھی ہے۔

اس خطبے کے ایک ایک لفظ سے قرآن وسنت کی ضرورت واہمیت اور انکی عظمت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ خصوصاً خطبہ کا یہ جملہ بار بار پڑھے جانے کے لائق بلکہ قابل حفظ ہے:

وتعلموا القرآن فانه احسن الحديث و تفقهوا فيه۔

دراصل یہی وہ جملہ ہے کہ جس نے مجھے اس خطبے کے انتخاب پر انگیخت کیا اس جملہ میں قرآن، حدیث اور فقہ تینوں الفاظ اکٹھے ملتے ہیں۔ اسمیں قرآن مجید کو احسن الحدیث کہا گیا ہے اور یہ وہی بات ہے، جو قرآن میں ایک جگہ اس طرح آئی ہے۔ اللہ نزل احسن الحديث (زمر/۲۳) اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے۔

اور وتفقهوا فیه میں وضمیر قرآن کی طرف راجع ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فقہ کا ماخذ و مصدر قرآن مجید ہی ہے۔ بالفاظ دیگر کہا جاسکتا ہے کہ قرآن حدیث بھی ہے اور فقہ کا موضوع بھی۔ گو فقہ اہلسنت میں ادلۂ اربعہ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس بیان کیئے گئے ہیں۔ اور ان سب کو اپنی اپنی جگہ ایک مستقل دلیل کی حیثیت دی گئی ہے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خطبے میں قرآن کو حدیث بلکہ احسن الحدیث کہہ کر گویا اسے عرفی حدیث سے ممتاز اور نمایاں کردیا ہے، جیسا کہ ایک جگہ خود قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

فبای حديث بعده يؤمنون۔ (المرسلت/۵۰) پھر وہ اس کے بعد کس کلام پر ایمان لائیں گے۔

مطلب یہ کہ قرآن ہی اصل حدیث ہے۔ جو اپنی حقانیت میں کسی سند کا محتاج نہیں ہے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی کوئی حدیث، خواہ قولی ہو یا فعلی، قرآن سے

متعارض نہیں ہو سکتی، کیونکہ حدیث (روایت) کی پرکھ کا سب سے بڑا معیار خود قرآن کریم ہے۔ جسمیں بتایا گیا ہے۔

واذا تتلىٰ عليهم اياتنا بينٰت قال الذين لا يرجون لقاءنا ائت بقرآن غير هذا او بدله ط
قل ما يكون لى ان ابدله من تلقآئ نفسى ج ان اتبع الا ما يوحىٰ الى ج انى اخاف ان
عصيت ربى عذاب يوم عظيم۔ (یونس/۱۵)

اور جب ان پر واضح احکام پیش کئے جاتے ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کے آرزومند نہیں کہتے ہیں کہ آپ اس کے سوا کوئی اور قرآن لے آیئے یا (اسکے احکام کو) بدل دیجیئے۔ آپ فرمادیجیئے کہ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اسے اپنی خواہش سے بدل دوں۔ میں تو اس وحی کی پیروی کا پابند ہوں۔ جو مجھ پر کی جاتی ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

اس آیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن ہی احسن الحدیث ہے۔ اس لیئے تو خطبہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں، تفقهوا فيه میں فقہ کا موضوع فقط قرآن کو بتایا گیا ہے کیونکہ فیہ میں وضمیر واحد قرآن کی طرف راجع ہے اور یہ وہی بات ہے جو سورۂ توبہ میں اس طرح آئی ہے:

وماكان المومنون لينفروا كآفة فلولا نفر من كل فرقة منهم طآئفة ليتفقهوا فى الدين
ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون۔ (التوبہ/۱۲۲)

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سارے کے سارے مسلمان ایک ساتھ نکل کھڑے ہوں تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آئے تا کہ وہ دین میں تفقہ (یعنی خوب فہم وبصیرت) حاصل کرے۔
اور واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائے تا کہ وہ لوگ بھی (غلطی کرنے سے) بچیں۔

آیت میں لیتفقهوا فى الدين کے الفاظ آئے ہیں اور خطبہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تفقهوا فيه، کے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں تفقہ دراصل دین میں تفقہ ہے۔ گویا قرآن دین کا دوسرا نام ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دین کی اقامت، قرآن کے ذریعہ ہوتی ہے۔ خدانخواستہ اگر قرآن کی نفی کردی جائے تو پھر دین کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ اس لیئے ہمارے غور وفکر اور تعقل وتدبر کا سامان قرآن کریم میں رکھ دیا گیا ہے۔ بایں معنی کہا جاسکتا ہے کہ عصر حاضر میں پیش آمدہ مختلف فقہی معاملات ومسائل کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے تا کہ قرآن سے مستخرج اور مستنبط فقہ مسلمانوں کے علمی وفکری اتحاد کا ذریعہ بن سکے۔

آیت میں مذکور تفقہ فی الدین کا مفہوم دورِ رسالت مآب ﷺ میں جو سمجھا گیا تھا وہ کچھ اور تھا کیونکہ اس وقت معروف معنیٰ میں کوئی فقہ موجود نہ تھی۔ اور اب تفقہ فی الدین کسی اور چیز سے عبارت ہے۔ یہ امر ہم سب کے لیئے لائق توجہ ہے۔

اب میں ان پہلوؤں کو بیان کروں گا جو میں نے اپنے ترجمے میں اختیار کیئے ہیں:

افیضوا فی ذکر اللّٰہ فانہ احسن الذکر ۔ میں ذکر سے مراد میں نے قانون خداوندی کولیا ہے۔ خدا کا قانون، چونکہ مختلف احکام کے مجموعے پر مشتمل ہے۔ اس لیئے اس جملہ کا ترجمہ میں نے بایں الفاظ کیا ہے۔ قانون خداوندی کی طرف بڑھو، کیونکہ یہ بہترین قانون ہے۔ میرے اس ترجمے کی تائید خطبے کے اگلے جملہ سے بخوبی ہوتی ہے جسمیں کہا گیا ہے وارغبوا فیما وعد المتقین یعنی اس چیز کے طلب گار بنو جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے۔ قرآن کی زبان میں متقین انہیں کہا جاتا ہے جن کے اعمال صالح ہوں۔ اس لیئے جملہ سابقہ میں ذکر اللہ سے قانون خداوندی کو مراد لینا نظم عبارت کے پہلو سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح واستنوا بسنۃ فانہا اھدی السنن میں اھدیٰ کا ترجمہ میں نے اسم تفضیل کی رعایت میں نیز حضور نبی پاک ﷺ کی سنت کی عظمت کے پیش نظر دوہرے مفہوم پر مشتمل الفاظ سے ادا کیا ہے۔ خطبۂ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ادا ہونے والا لفظ "اھدیٰ" دراصل مبنی للمفعول بھی ہے اور مبنی للفاعل بھی۔ کیونکہ اسم تفضیل جیسے اسم فاعل کے لیئے آتا ہے۔ ویسے ہی اسم مفعول کے لئے بھی آتا ہے۔ حالتِ فاعلی میں اسکے معنی ہوتے ہیں بہت زیادہ ہدایت دینے والا اور حالتِ مفعولی میں اسکے معنی ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ ہدایت یافتہ۔ اور یہاں یہ لفظ مجھے دونوں معنی کا جامع دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ یہ کلام جس سے ادا ہوا ہے۔ اور جس کے لیئے ادا ہوا ہے وہ دونوں ہستیاں اپنی اپنی جگہ انتہائی شان جامعیت کی حامل ہیں۔ اس لیئے ضروری ہے کہ میں اسے دونوں طرح سے نمایاں کروں۔ چنانچہ میں نے اس کا ترجمہ بایں الفاظ ادا کیا ہے۔ اور اسکی سنت کو اپناؤ کیونکہ اسکی سنت، تمام سنتوں سے زیادہ ہدایت یافتہ اور سب سے بڑھ کر ہدایت رساں ہے۔ واحسنوا تلاوتہ فانہ احسن القصص (خطبۂ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اس جملہ میں تلاوۃ کے مفہوم کی ادائگی خود تلاوت کے لفظ سے کی گئی ہے۔ جبکہ میں اپنے ترجمے میں تلاوت کے معنی پیروی کرنے، پیچھے پیچھے چلنے کے بیان کیئے ہیں۔ اس معنی کی سند ہمیں قرآن کی اس آیت سے ملتی ہے۔ والقمر اذا تلٰہا (الشمس ۲/) اور چاند کی شہادت کہ جب وہ سورج کے پیچھے پیچھے چلے۔ اور احکام کی پیروی واتباع کی مثال کے لیئے یہ آیت دیکھیئے:

الذین اٰتینٰھم الکتاب یتلونہ حق تلاوتہ اولٰئک یومنون بہ۔ (البقرۃ ۱۲۱/)

وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اسکی پیروی کرتے ہیں جیسا کہ اسکی پیروی کا حق ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو اسپر ایمان لاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہاں تلاوت کے معنی پیروی کرنے کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اس میں تلاوت کرنے والوں کو "یومنون بہ" کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ اگر یہاں تلاوت کا مفہوم فقط پڑھنا لیا جائے تو لازم آئے گا کہ اسکی تلاوت کرنے والے، ہر حال میں اس پر ایمان بھی لائیں۔ جبکہ مستشرقین اور غیر مسلم دانشوروں کی ایک معتدبہ تعداد قرآن کریم کو پڑھتی تو ہے مگر دولت ایمان سے بہرہ ور نہیں ہوتی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آیت مذکورہ میں تلاوت کا مفہوم پیروی واتباع ہے نہ کہ فقط پڑھنا۔

اس طرح احسن القصص کا مفہوم میں نے بہترین نشانات قدم کی اتباع سے ادا کیا ہے اور زجاج نے بھی اس کا معنی اتباع الاثر سے بیان کیا ہے۔ قص دراصل کسی کے نقش قدم پر چلنے کو کہا جاتا ہے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کرنے کے ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وقالت لاختہ قصیہ فبصرت بہ عن جنب وھم لا یشعرون۔ (القصص ۱۱/) اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی بہن سے کہا کہ ان کا حال معلوم کرنے کے لیئے اسکے پیچھے پیچھے جاؤ، پس وہ انہیں دور سے (پیچھا کرتے ہوئے) دیکھتی رہی اور وہ لوگ اس امر سے بالکل بے خبر رہے۔ سورۂ کہف میں آتا ہے۔

قال ذلک ما کنا نبغ فارتدا علیٰ اٰثارھما قصصا۔ (الکہف ۶۴/)

موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہی وہ مقام ہے جو ہمارا مطلوب تھا، پس وہ دونوں اپنے نشانات قدم پر وہی راستہ تلاش کرتے ہوئے اسی مقام مطلوب پر واپس پلٹ آئے۔

ان قرآنی تائیدات وشہادات کی روشنی میں میں نے جملہ مذکورہ کا ترجمہ بایں الفاظ ادا کیا ہے۔ اور اسکی پیروی بہترین انداز سے کرو کیونکہ اسمیں تمہارے لیئے بہترین نشانات قدم کی اتباع کا سامان موجود ہے۔

معزز سامعین کرام! میں نے اپنی گفتگو میں انتہائی اختصار سے کام لیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ نہج البلاغہ کی علمی وادبی عظمت کے ضمن میں میرے مختصر اظہار رائے کو کسی بڑی کوشش کی تمہید سمجھا جائے گا۔

واٰخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔